اقبال کا نظریۂ خودی

ضامن نقوی

بعض ارباب علم یہ سمجھتے ہیں کہ اقبال کا نظریۂ خودی مغربی فلسفہ کی تعلیم سے ماخوذ ہے، جسکی اساس انفرادی تاثر انانیت پر ہے یعنی ایسے انائے فردی پر جس میں تاثر خدا کے لئے یا عقیدۂ توحید کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے بلکہ اگر یہ کیف انا ذرا اور تیز ہو جائے تو ہر سرشار و مست کیف خودی، نعرہ انا ربکم الاعلی فرعون کی طرح لگا سکتا ہے گویا کہ اقبال کی خودی کا تصور مسولینی اور ہٹلر کی انانیت کا ترجمان تھا، العیاذاً باللہ۔

بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اقبال کے نظریۂ خودی کا پس منظر ویدانتی فلسفہ وحدت وجود وہمہ اوست ہے، حالانکہ یہ دونوں گمان باطل ہیں، نہ اقبال کا نظریۂ خودی، افکار فلسفیان مغربی سے ماخوذ ہے نہ اس میں ہمہ اوست کی ترجمانی ہے بلکہ اس کے تکیف میں خالص قرآنی و اسلامی روح موجزن ہے۔

ہم پہلے اقبال کے چند اشعار پیام مشرق سے نقل کرتے ہیں پھر اپنے اس تاثر کی وضاحت کرینگے کہ اقبال کے نظریۂ خودی میں کہاں تک تعلیم قرآنی کی روح ہے۔ ملاحظہ فرمائیے :—

چہ لذت یارب اندر ہست و بود است　　دل ہر ذرۂ در جوش نمود است
شگافد شاخ را چوں غنچۂ گل　　تبسم ریز از ذوق وجود است

اس قطعہ میں ذوق نمود و وجود ملحوظ رہے مگر تبسم ریزی کی ادبی و معنوی لطافت کو موضوع تاثر بناتے ہوئے —

زمین خاک در میخانۂ ما　　فلک یک گردش پیمانۂ ما
حدیث سوز و ساز من دراز است　　جہان دیباچہ افسانۂ ما

اس قطعہ کا چوتھا مصرعہ تاثر و تفکر طلب ہے یعنی ''جہان دیباچۂ افسانۂ ما''

ضمیر کن فکاں غیر از تو کس نیست　　نشان بے نشاں غیر از تو کس نیست
قدم بیباک تر نہ در رہ زیست　　بہ پنہائے جہاں غیر از تو کس نیست

اس قطعہ کا بھی چوتھا مصرعہ ترجمان معنی مقصود ہے ۔ یعنی بہ پنہائے جہاں غیر از تو کس نیست

جہاں ما کہ پایان ندارد — چو ماہی در یم ایام غرق است
یکے بر دل نظر وا کن کہ بینی — یم ایام دریک جام غرق است

یہ قطعہ بھی اپنے چوتھے مصرعہ کے لئے کہا گیا ہے اور وہی معنی مقصود کا ترجمان ہے ۔

توی گوئی کہ من ہستم، خدا نیست — جہان آب و گل را انتہا نیست
ہنوز این راز برمن ناکشود است — کہ چشمم آنچہ بیند ہست یا نیست

بہ پنہائے ازل پرمی کشودم — ز بند آب و گل بیگانہ بودم
بچشم تو بہائے من بلند است — کہ آوردی ببازار وجودم

بازار وجود سے جس حقیقت آفرینش کی طرف اشارا کیا گیا ہے اس کی طرف توجہ فرمائے !

دل من راز دار جسم و جان است — نہ پنداری اجل بر من قرآن است
چہ غم گر یک جہان گم شد ز چشمم — ہنوز اندر ضمیرم صد جہان است

جس ضمیر میں بیشمار جہان آفرینش مضمر ہوں اسکی وسعت پر غور فرمائیے ! کیا اس ضمیر کی ترجمانی کانشنس کے اس تصور سے ہوسکتی ہے جو گرد پیش اور تعلیم و تربیت کے اثر سے نفس انسانی میں پیدا ہو جاتا ہے، تجربی نفسیات کا بھی تو اندازہ ہے کہ جس شے کو کانشنس کہتے ہیں وہ کوئی جبلی و فطری شے نہیں ہے ؟

اقبال کے مندرجہ بالا اشعار سے یہی اثر دل قبول کرتا ہے کہ انکے نزدیک ایک حقیقت کلی، انائے انسانی یا بشری خودی کی معنوی صورت میں رونما یا نمودار جو جزو کل آفرینش یعنی جملہ موجودات کی اصل واحد ہے، اس تصور انائے کلی کے ذیل میں، انائے فردی کی حقیقت موج دریا یا تجلی آفتاب کی سی ہے ۔ عالم موجودات کی یہی اصل واحد، کم و کیف اور رنگ و بو کے ہر مظہر میں ظاہر ہے ۔

دیکھنا یہ ہے کہ یہ تاثر کیا اقبال کا خود اپنا ایسا اختراعی تاثر ہے جسکی کوئی اصل تعلیم قرآنی و تدریس اسلامی یعنی قرآن حکیم، مستند احادیث رسول اکرم (ص) اور اقوال اصحاب اور پھر صاحبان اسرار دین مفسر قرآن مبین کے کلام میں نہیں ملتی ہے؟ اس شبہ کے ازالہ کے لئے مندرجہ ذیل حقائق قرآنی اور تفسیر حقائق کو ملاحظہ فرمائیے :—

الف — و فی انفسکم افلا تبصرون (قرآن حکیم)
یعنی تمہاری حقیقت خود تمہارے نفسوں میں مضمر ہے - چشم بصیرت سے تم کام کیوں نہیں لیتے ؟

ب — اول ما خلق اللہ نوری (حدیث) سب سے پہلے جو شے اللہ نے پیدا کی وہ میرا نور (یعنی نور انسانیت کامل) ہے -

ج — انا من نور اللہ و کلھم من نوری (حدیث) میں اللہ کے نور سے ہوں اور تمام کائنات میرے نور کا ظہور ہے - یعنی حقیقت وجود انسانی ذرہ و مہر، نجوم و ماہ ارض و سما کی تخصیص نہیں، ہر صورت آفریدہ میں، صورت پذیر و منیر ہے -

د — لولاک لما خلق الافلاک (حدیث قدسی) اگر خدا مجھکو نہ پیدا کرتا تو ارض و سما یعنی تمام عالم و عالمیان کو بھی پیدا نہ کرتا - معلوم ہوا کہ وجہ تخلیق و مقصود آفرینش حقیقت انسانیت کبریٰ کا ظہور ہی ہے - با الفاظ دیگر عالم کائنات کے ذرہ ذرہ میں جلوہ مقصود آفرینش ہی کی شمع عالم آرا روشن ہے - تمام عالم مرات انور حقیقت انسانیت ہے -

و — انت تزعم انک جرم صغیر و فیک انطوی العالم الاکبر (ارشاد حضرت علی مرتضیٰ رض) تو اس خیال میں ہے کہ تو ایک جرم صغیر و حقیر ہے حالانکہ تجھ میں ایک عالم کبیر مخفی ہے -

ز — من عرف نفسہ فقد عرف ربہ (ارشاد حضرت علی مرتضیٰ رض) جسنے اپنے نفس کو پہچانا اسنے اپنے رب کو پہچانا — خود شناسی، خدا شناسی ہے -

ح — انا نقطتہ باء بسم اللہ و انا القلم و انا اللوح المحفوظ و انا العرش و انا الکرسی وانا السبع السموات وانا الارضون وانا حی لایموت الخ خطبہ' سیدنا علی مرتضیٰ رض مذکور فتوحات مکیہ، جواہر الحقائق و اسرار الحق (بحوالہ مراۃ الحق)

میں ھی نقطه بائے بسم الله یعنی نقطهٔ آغاز آفرینش ھوں، قلم و لوح، عرش و کرسی، ھفت آسمان و زمین ھوں اور میں ھی وہ زندہ ھوں جو (لا زمانی و لا مکانی) غیر فانی ھے معلوم ھوا کہ حقیقت انسانی غیر فانی ھے۔

کچھ شک ھی نہیں اگرچہ فانی ھوں میں
لیکن یہ بنائے جاودانی ھوں میں
کیوں موج مسلسل نہ ھو ھستی گویا
کس بحر وجود کی روانی ھوں میں

م — لیس فی جبتی الا الله (حضرت جنید بغدادی کا مشہور قول) میرے جبہ میں نہیں ھے مگر الله

ط — اقبال رح نے بھی اسی تاثر کی ترجمانی کی ھے —

پنہاں یہ ضمیر من صد عالم رعنابیں
من کسوت انسانم، پیراھن یزدانم (پیام مشرق)

ی — حضرت فرید الدین عطار رح فرماتے ھیں —

تو بمعنی جان جمله عالمے
هر دو عالم خود توئی بنگر دمے

ک — حضرت ابن عربی رح فرماتے ھیں — فلکل عبارت وانت المعنی کل عالم ایک عبارت ھے اور تو اسکا واحد مفہوم ھے، تو کی ضمیر حقیقت عالم ھی کی طرف راجع ھے۔ حضرت ابن عربی رح نے بھی خصوص الحکم میں انسان کی تعریف معنی، عالم کبیر سے کی ھے یعنی تمام کائنات کو اسی کی حقیقت کا آئینہ بتایا ھے۔

ل — حضرت بایزید بسطامی رح کا ایک مشہور قول سبحان ما اعظم شانی ھے یعنی سبحان الله میری ذات کس قدر اعظم و معظم ھے اس قول کا تذکرہ حضرت رومی رح نے اپنی مثنوی میں بھی کیا ھے۔

اس قسم کے تمام اقوال کی حقیقت جیسا کہ بایزید حضرت بسطامی رح نے ھے کہا بھی ھے کہ کسی اھل حال انسان کے دل میں جب اسکی حقیقت منکشف ھوتی ھے تو بیساختہ اسکی زبان پر کبھی کبھی ایسے کلمات بھی آ جاتے ھیں

جن کا پس منظر وهی جذبه توحید هوتا هے جو انکشاف حقیقت سے پیدا هوتا هے، ایسے اقوال پر گمان ادعائے کبریائی صحیح نہیں هے ۔ حضرت نیاز بے نیاز بریلوی رح فرماتے هیں —

گر حرف بے نیازی سرزد نیاز سے هو
پتلے میں خاک کے هے پیارے غرور تیرا

تصریحات مذکور بالاء اس حقیقت کے اثبات کے لئے کافی هیں که —

نه من تنہا دریں میخانه مستم
جنید رح و شبلی رح و عطار هم مست

اقبال رح کا نظریه خودی کلیسائے مغرب کے چراغوں (یورپ جدید کے فلسفیوں) سے نہیں، مشرق کے اس آفتاب عالم تاب کی ضیا باریوں سے منور هے، جسکے انوار سے اقتباس ضیا کرنے والوں میں یه مدارج قرب واحد تجلیات آل و اصحاب رسول اکرم صلی الله علیه وسلم هیں اور ان کے واسطه سے یه لو زمانه بعد کے اور دوسرے چراغان حرم، حضرت جنید رح و شبلی رح، سیدنا محی الدین جیلانی رح، خواجه بہاء الدین نقشبند رح، حضرت سنائی و عطار و رومی رح، خواجه خواجگان غریب نواز رح نیز بے شمار صاحبدل حضرات میں حسب استداد قبول ضوفگن و متجلی هوئی ۔ اقبال کے دل میں بھی یه فیض رحمت عالمیان دور حاضرہ میں حدیث انا من نور الله کی شعاعیں ضوفگن هوئیں تو نه جانے والے کیوں ادھر آدھر نگاهیں پھیرتے هیں ۔

اقبال کا دور وہ تھا جب ابنائے ملت کے دل میں وہ احساس اعزاز نفس مردہ هو چکا تھا جسکا پرچم بلند حضرت صدیق رض و عمر رض اور حضرت علی کی شخصیت میں وہ تاثر اندرونی تھا جسکے سامنے فرشتوں کی پیشانیاں مرتبت آدم کے سامنے خم تھیں مگر اس کے خلاف هماری پستی اس حد کو پہونچ چکی تھی که صرف غلامی اغیار هی نہیں وہ کونسی ایسی ذلیل سے ذلیل خصلت نہیں تھی جو هم میں نه پائی جاتی هو اور وہ کونسا کافرانه عمل نہیں تھا جو به نص قرانی کافروں کے لئے مخصوص تھا اور هم نام کے مسلمان جسکے خوگر نہیں تھے !! مولانا حالی کی زبان سے اس مرگ ملت کا ماتم حق بجانب مگر کہاں تک ؟ آخر اس غم و مرض دیرینه کا کوئی علاج بھی ؟ علاج متعدد تجویز هوئے، یونیورسٹیوں اور کالجوں کی صورت میں بھی، دارالعلوم اور ندوہ کی صورت میں بھی مگر علاج سے پہلے صحیح تشخیص مرض، یعنی خاص سبب مرض کا

معلوم کرنا ضروری تھا۔ اقبال رح کی تشخیص میں وہ سبب مرض جسنے روح ملت کو فنا کے ہم آغوش کردیا تھا افراد کی خود فراموشی یعنی اس مقام و مرتبت مرد مومن سے نظری و عملی طور پر قطعی بیگانگی تھی جسکی طرف قرآن اہل ایمان کو اپنی آیت، انتم الاعلون ان کنتم مومنین سے بلاتا ہے اور وہ مقام وہی تھا جسکی طرف سورۂ بقر میں رہنمائی کی گئی ہے کہ آدم مسجود ملائک ہیں۔ اس تشخیص صحیح کے مطابق اقبال افراد ملت میں اسی روح کو زندہ کرنے کی کوشش کرتا ہے جسکی مردگی یا نیند نے تمام قوم کو عملی موت، ذہنی غلامی اور ہر اس عمل کا خوگر بنادیا تھا جسکو ذرا سی بھی اپنی عزت نفس محسوس کرنے والا انسان کبھی گوارا نہیں کر سکتا۔ یہ تھا ملت بیمار کے مرض کا علاج اقبال کی نظر میں اور یہ تھا اقبال کا نظریہٗ خودی۔ مقام غور ہے کہ جو انسان اپنی ہستی کی اصل کو حاصل تخلیق کون و مکاں، محور گردش مہر و ماہ و نجوم، مقصود آفرینش، نائب خدا، مسجود ملائکہ، مومن کامل ہونے کی حیثیت سے سمجھتا ہو یا جو کسی مومن کامل کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کرتا ہو وہ اور دل سے غلامیٔ اغیار، وہ اور بالعمل تقلید فجار، وہ اور مکر و فریب، وہ اور ناحق کوشی اور ظلم ؟ جب تک کسی مسلمان کے سامنے سیرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی راہ معراج کی غیر متناہی بلندی رہیگی وہ کبھی بھی سیئات کو حسنات نہیں سمجھ سکتا، وہ کبھی بھی کفش اغیار کو غلامی میں اپنے سر کا تاج نہیں سمجھ سکتا۔ یقیناً ان امور کے ارتکاب سے کم سے کم اس کا دل ضرور کڑھیگا اور اپنی اس حالت پر اسکو ندامت ضرور ہوگی۔ طائر مجبور قفس کبھی کبھی حصول آزادی کے لئے پر ضرور پھڑ پھڑاتا ہے یہی اسکی زندگی کی علامت ہے۔ لیکن غیرت خودی کا شعلہ اگر دلوں میں بھڑک اٹھے تو کسی قید و بند کا وجود باقی نہیں رہ سکتا ــ پرواز ہے وہی جو قفس تک اڑا سکے۔

حاصل یہ کہ اقبال کے نظریہٗ خودی کی اساس آیت قرانی لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم اور اسکی تفسیر انا من نور اللہ وکلھم من نوری ہی پر ہے۔ وہ لوگ غلط فہمی میں مبتلا ہیں جو مسولینی اور ہٹلر کی خودی اور اقبال کے نظریہ خودی میں کوئی امتیاز نہیں کرتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ احساس خودی یا خود شعوری (Self-consciousness) ہر صحیح الفطرت انسان میں کم و بیش پایا جاتا ہے لیکن ترقی یافتہ ذی شعور فرد اپنے مدارج ارتقائے خودی میں اپنی فردی خودی کو قومی خودی میں اور قومی خودی کو نوعی خودی میں محو پاتا ہے ــ موج ہے دریا میں اور بیرون دریا کچھ

نہیں— مگر یہ ارتقائے شعور انا اپنی ترقی کی انتہائی منزل نہیں، اسکے بعد اگلی منزل ارتقا وہ ہے جس میں ترقی یافتہ انسان (مومن کامل) اپنی اس خودی کو جو فرد و قوم سے گذر تمام نوع انسانی کو اپنے حلقۂ کرم سمیٹے ہوئے ہوتی ہے، خدا کی شان ربوبیت و رحمت میں اس شان سے محو پاتا ہے کہ اسکی خودی عبدیت اور اسکی عبدیت، عبد کامل محمد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مظہر ہوتی ہے[1] اب بندہ و رب میں کوئی درمیانی حجاب ہی نہیں ہوتا ہے۔ یہاں کھلتے میں المصلات معراج موجیں کے راز و اسرار۔ ظاہر ہے کہ یہ عروج بغیر پیروی اسوۂ پاک حاصل نہیں ہوسکتا۔ اس ارتقا کے خلاف جن تنگ نظر اشخاص کی نظر اپنی محدود خودی کے دائرے سے آگے نہیں بڑھتی انکی سافلیت کے بھی متعدد درجات ہیں نمرودیت و فرعونیت پر کچھ انحصار نہیں ہے۔

رہا یہ سوال کہ آیا اقبال کا نظریہ خودی، اگر خودی کو اپنے وسیع ترین معنوں میں تمام کائنات کم و کیف کی اساس سمجھ لیا جائے، نظریۂ وحدت وجود کے مترادف ہے یا نہیں۔ ویدانتی وحدت وجود (ہمہ اوست) کی تفصیل میں یہی تو ہے کہ ایک وجود تمام کائنات کے مظاہر کی اصل و حقیقت ہے، اس وجود واحد کی مثال ایک تخم کی سی ہے جس سے پورا شجر کائنات پیدا ہوا اور نشو و نما پا کر اپنے گل و ثمرات تک پہونچا ہے اسلئے ہر جزو شجر، عین تخم شجر ہی ہے کوئی دوسری شے نہیں با الفاظ دیگر اگر وجود واحد کو لا موجود الا اللہ مان لیا جائے اور انہیں معنوں میں جیسا کہ اہل وحدت وجود سمجھتے ہیں اور اس عقیدے کو کائنات آفرینش کے ہر جزو کل پر منطبق کیا جائے تو ہر جزو کائنات پر یعنی خشک و تر، رطب یاس پر ذات خدا کا اطلاق صحیح سمجھا جا سکتا ہے، اس عقیدہ میں علاوہ دوسرے مغالطات فکری کے سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ اس سے نظام اخلاق قطعاً درہم برہم ہو جاتا ہے اور امتیاز نیک و بد بالکل اٹھ جاتا ہے، قاتل و مقتول

---

[1] نفخت فیہ من روحی (قرآن حکیم) آدم میں خدا نے اپنی روح پھونکدی یعنی اپنی شان اپنے نائب میں پیدا کردی۔ خدا رب العالمین ہے اس کا سب سے بڑا نائب رحمتہ اللعالمین۔ یہ شان رحمت جس فرد انسانی میں جتنی ہو اتنا ہی بڑا وہ انسان ہے۔ حدیث نبوی ہے کہ، سب سے بہتر وہ انسان ہے جو سب سے زیادہ دوسروں کے کام آئے۔

دونوں ایک وجود واحد (خدا) کے نمائندے یا عین خدا پھر جب صورت حال یہی سمجھ لی جائے تو کیا نیک اور کیا بد اور کیا مقصد تعلیم حسنات اور کیا شائت بعثت انبیا و مرسلین ؟

مگر اقبال کا نظریہ خودی اس سے قطعی مختلف عقیدے کا شارح ہے۔ اسکی اساس انا من نور اللہ حدیث رسول اکرم (ص) پر ہے۔ یہ حدیث یہ بتاتی ہے حقیقت انسانیت کبریٰ جو مقصود تخلیق کائنات ہے اسی کا ظہور تمام مظاہر کائنات میں ہے لیکن متصف انسانیت کبریٰ، انسان کامل کی ذات گرامی، خدا نہیں، برگزیدہ مخلوق خدا ہے یا الفاظ دیگر انسان کامل لسان قرانی میں عبد کامل کے خطاب سے موسوم ہے (سبحان الذی اسریٰ بعبدہ) ۔

اس حقیقت کے پیش نظر اقبال کا نظریہ خودی، مفسر معنی عبدیت کاملہ اور مرتبت ذات انسان کامل کا شارح ہے، وحدت وجود (بمعنی همه اوست) کا معترف نہیں ۔ اس نقطہ نظر کو پھیلائیے، ہر فرد انسانی، ایک فرد اپنی حقیقت کلی یعنی انسانیت کا ہے، زید ہو کہ عمر دونوں انسان ہوتے ہیں مشترک اور دونوں کو آپس میں ملانے والا رشتہ عبدیت اور دونوں پر انہیں احکام کی اطاعت فرض، جو عبدیت کامل کے نشانات راہ و منزل ہیں ۔

مقالہ ھذا کے اس مقام پر پہونچکر آپ یہ غور فرمائیے کہ مرد مومن کی خودی بمعنی خود شناسی احساس عزت و قدر ذات ایک طرف اس کے دل میں پیدا کرتی ہے دوسری طرف اسے رشتہ توحید سے منسلک کرکے تمام افراد ملت سے بالخصوص اور جملہ بندگان خدا سے بالعموم اس قدر متحد کردیتی ہے کہ ایک فرد کا درد دوسرے کے دل کو تڑپا دیتا ہے مگر شرط ہر فرد کا بندۂ خدا تہ دل سے ہونا ہے، رسمیات اور نمایشی امور سے یہ شے پیدا نہیں ہوتی ہے، اسکے ساتھ ان فضائل و مکارم اخلاق سے بھی مرد مومن کو مشرف کر دیتی ہے جو عبدیت کاملہ سے وابستگی اور پیروی انسان کامل سے پیدا ہوتے ہیں ۔ قرآن پاک میں رسول کریم سے فرمایا گیا ہے کہ آپ یہ فرما دیجئے کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی اختیار کرو، اللہ تم سے محبت کریگا یعنی تم خدا کے محبوب ہو جاؤ گے، تخلقو باخلاق اللہ یا اوصاف الہیہ سے متصف ہونے کا مفہوم یہ ہے ۔

لیکن خودی کا یہ فلسفہ اور اسکے الهیاتی معارف جو تمام تر مابعد الطبیعاتی میں جبھی معتبر ہیں جب ان کا کوئی وجود بھی قابل یقین ثابت ہو

اگر خود اور خودی کا کوئی وجود بجز ایک مادی کیفیت کے عندالتجربہ معتبر ثابت نہ ہو تو وہ پوری عمارت ہی جو بنائے خودی پر تعمیر کی گئی ہو ایک بے بنیاد ہوائی قلعہ سے زیادہ کوئی مقام عالم مشاہدات میں نہیں رکھتی ہے یہ ہے مادین کا اعتراض نظریہ' خودی کے خلاف۔ یہ بھی سمجھنے کی بات ہے کہ اگر انسان کی ہستی مجموعہ' خاک و غبار ہی ہے تو پھر اعزاز نفس و قدر ذات کے معنی ہی کیا ہیں؟ نہ خودی کوئی شے ہے نہ بیخودی۔

اجمالی جواب تو اس اعتراض کا یہ ہے کہ انائے انسانی یا بشری خودی، تکیف و شعور ذات (Self-consciousness) کا نام ہے پھر چونکہ مادے کے تصور میں شعور و فہم کی کوئی گنجائش نہیں ہے اسلئے بشری خودی کو کسی صورت سے مادی نہیں سمجھا جاسکتا ہے۔ اس اجمال کی تفصیل حسب ذیل ہے :-

ماہیت مادہ اور مادیت۔

انسان جسم رکھتا ہے وہ خود اپنا جسمانی ہونا ہر وقت محسوس کرتا ہے۔ اس احساس کے ثبوت کی کوئی احتاج ہی نہیں مگر اسکے ساتھ ہی ہر امر میں غور و فکر، مقاصد کے حصول کیلئے مناسب اسباب کا تجویز کرنا اور منصوبہ بندی، انسان کی صلاحیت تدبر و تدبیر اس حقیقت پر شاہد ہے کہ ان اعمال کی محرک و مرکز کوئی قوت بھی انسان میں ہے، اس طرح سوچنے سمجھنے کی صلاحیت و استعداد یا قوت تدبیر و تدبر یعنی ذہن کے وجود سے انکار ممکن نہیں مگر ذہن و جسم میں کیا باہمی تعلق ہے اس مسئلہ پر غور فرمائیے!

جسم ممتد، ارض و طول و عمق، ابعاد ثلاثہ رکھنے والی اور ایک متغیر، جگہ کو گھیرنے والی نیز قابل تجزیہ و تقسیم ایک شے ہے مگر جسم کے ان لوازم ذاتی کے خلاف ذہن انسانی، نہ ممتد و متغیر اور نہ قابل انقسام و تجزیہ یعنی جسم کاٹا جاسکتا ہے بانٹا جا سکتا ہے مگر ذہن نہ کاٹا جا سکتا ہے نہ بانٹا جا سکتا ہے پھر جسم، حجم و وزن رکھتا ہے مگر ذہن نہ جسم و حجم رکھتا ہے نہ وزن و مقدار، دونوں ایک دوسرے کے نقیض معلوم ہوتے ہیں، جن کا اجتماع یا اتحاد کسی نظام واحد میں محال عقلی ہے۔ مگر ہم دیکھتے ہیں، محسوس کرتے ہیں، براہ راست ہمارے مشاہدے میں ہے کہ ذہن کی ہر جنبش و حرکت ذہنی، قصد و ارادہ، تخیل و تصور، جذبات و احساسات کا اثر جسم قبول کرتا ہے مثلاً شدید غصہ میں چہرہ سرخ

اور جسم گرم ہو جاتا ہے، انتہائے شرم و خجالت میں جسم سے پسینہ ٹپکنے لگتا ہے ۔

نہ ہم سمجھے نہ آپ آئے کہیں سے، پسینہ پونچھئے اپنی جبیں سے

اگر موت کا خوف و وہم اچھے خاصے انسان پر طاری ہو جائے تو دل بیٹھنے لگتا ہے، دم رکنے لگتا ہے اور اگر یہ کیفیت بڑھ جائے تو موت بھی واقع ہو سکتی ہے، فرط مسرت میں بھی آدمی شادی مرگ ہو جاتا ہے ۔ اس کے برخلاف شدید عوارض جسمانی میں یا تو ذہن کا معمولی عمل رک جاتا ہے یا اس میں خلل واقع ہو جاتا ہے مثلاً سرسام (ورم دماغی) میں یا بے ہوشی و غشی میں ۔ سوال یہ ہوتا ہے کہ دو نقیض ایک دوسرے کا اثر کیوں قبول کرتے ہیں، ان میں باہمی ربط علت و معلول کیوں کر ہے، جب ان کا اجتماع ہی محال ہے ۔ یہ طے شدہ مسئلہ ہے کہ اجتماع نقیضین محال ہے۔ اس اعتبار سے تو نہ غیر جسم (ذہن) جسم پر اثر انداز ہوسکتا ہے، نہ جسم، غیر جسم (ذہن) پر ۔ دونوں میں کوئی تعلق ہی نہیں سمجھا جا سکتا ؟ مگر صورت حال اس نظریہ کے خلاف مشاہدے میں ہے، دونوں میں ربط علت و معلول ہم پاتے ہیں ۔ کیا ذہن و جسم دونوں کسی حقیقت مشترک کے اعراض و مظاہر تو نہیں ہیں جو ایک دوسرے سے ایک مرتب ارتباط رکھتے ہیں یا حقیقت کچھ اور ہے سوال یہ ہوتا ہے ؟

مشاہدات تجربی سے یہ معلوم ہوا ہے کہ جسم انسانی عناصر سے جنکی تعداد چار کے بجائے تقریباً ۹۰ ہے مرکب ہے ۔ اور عناصر کا تجزیہ مشاہدات کو ذرات (ایٹم) تک لے جاتا ہے پھر ذرات کا تجزیہ بعض شعاؤں (الیکٹرون) پر منتہی ہوتا ہے ۔ لیکن شعاعیں چونکہ دوسری کیفیات کی طرح قائم بالذات نہیں سمجھی جاسکتیں، اس لئے کہ کوئی کیفیت قائم بالذات نہیں ہوتی ہے اس صورت حال میں ایک ایسی وحدت بسیط کا تصور سامنے آتا ہے جو قائم بالذات ہو اور وہی حامل جملہ اعراض کیفیاتی و کمیاتی ہو۔

تحقیق جدید ایسی وحدت بسیط کا اثبات کرتی ہے، انکار نہیں ۔ سائنس جدید کی اصطلاح میں اسے انرجی (توانائی) کہا گیا ہے ۔ یہ ہے جسم و حجم رکھنے والے ان عناصر کی ماہیت جن سے جسم انسانی مرکب ہے مگر قابل غور یہ امر ہے کہ جب انرجی میں کوئی جسم و حجم اورجسم و حجم کے ساتھ کوئی وزن متحقق نہیں، اس لئے کہ ایسی کسی قوت میں اس قسم کی کسی شے کا کوئی

شائبہ بھی قابل تسلیم نہیں تو انرجی کے مظاہر یعنی عناصر میں کہاں سے آگیا اور اگر عناصر میں کوئی وزن نہیں ہے تو جسم انسانی کو (جن سے جسم انسانی مرکب ہے) کس طرح ذی وزن و مقدار سمجھا جاسکتا ہے ؟ مگر وزن کے وجود کا انکار بھی ممکن نہیں، کائنات اجسام میں ذرے سے لیکر خورشید تک ہر شے کوئی وزن رکھتی ہے، انسانی جسم بھی اس کلیہ سے مستثنی نہیں ہے۔ معلوم کرنا یہ ہے کہ دراصل وزن کا تصور کوئی اضافی شے ہے یا اسکا کوئی حقیقی وجود بھی ہے ؟

جب تک مشاہدات نے ترقی نہیں کی تھی مسئلہ جذب و کشش کے بعض اہم نتائج سامنے نہیں آئے تھے مگر آج تجربات سے یہ حقیقت بے نقاب ہوچکی ہے کہ کسی جسمانی شے میں اپنا کوئی وزن نہیں، کشش ارضی کو پار کرکے کسی شے میں کوئی وزن باقی نہیں رہتا ہے مثلاً ایک جسم و حجم و وزن رکھنے والا شخص جب پرواز کرتا ہے اور کشش ارضی کو پار کر لیتا ہے تو اسکا وزن تو مطلقاً غائب ہو جاتا ہے، جسم و حجم کی صرف ایک ایسی تصویر باقی رہ جاتی ہے جسکو کاغذی تصویر بھی نہیں کہہ سکتے، اس لئے کہ کاغذی تصویر میں بھی اس کے کاغذ کا کچھ نہ کچھ وزن ہوتا ہے جسپر وہ کھینچی جاتی ہے، یوں کہنا چاہئے کہ ایک شعاعی تصویر ہی انسان کا حجمی وجود کشش ارضی کو پار کرنے کے بعد باقی رہ جاتا ہے، جس میں وزن و مقدار کا یا وزن و مقدار کے اندازے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے۔

اس مشاہدے سے مادے کی ماہیت پر ایک نئی طرح کی روشنی پڑتی ہے۔ مادے یا ذرات جسمی و مادی سے جب وزن حذف ہوگا تو ان کا وجود بجز ایک شعاعی صورت حال کے اور کیا باقی رہا، غور فرمائیے ! اور جب مادہ ہی بے وزن و مقدار ہوکر نہ رہا تو تمام عالم اجسام کا وجود کیا رہا ؟ اس جزو کو اسکے کل کے ذیل میں دیکھئے، یہ تو ہے جسم و حجم، وزن و مقدار کی ماہیت، اب شکل و صورت پر نظر کیجئے، اگرچہ صورت شعاعی بھی ایک طرح کی صورت ہی کہی جا سکتی ہے مگر اسکا کوئی جداگانہ وجود نہیں ہوتا ہے، صرف انعکاس کی حد تک اس کا وجود ہوتا ہے، انعکاس غائب، صورت غائب۔ دیمقراطیس کے زمانہ سے عرصہ مابعد تک مادئین کے نزدیک مادے کے لوازم ذاتی (جن کے بغیر مادہ پایا ہی نہیں جا سکتا) وزن و مقدار، شکل و صورت وغیرہ ہی رہے اور مادے کی تعریف وہ انہیں ذاتیات مادہ سے

کرتے ہے۔ اگر یہی مادہ تھا جو آج تو انکا وجود کہیں پایا نہیں جاتا ہے، جسم و حجم، وزن و مقدار، شکل و صورت، ظرف و زماں، تمام تعینات اضافی اس وحدت بسیط کے معلوم ہوتے ہیں جو بے ہمہ و با ہمہ ہے[1] یعنی جو لا تعین اور با ہر تعین ہے۔

اس تحقیق کے علاوہ نظریۂ جوہریت کے دوسرے انکشافات جدید سے بھی مادئیت کے دیرینہ تصور کا بڑی حد تک ابطال ہوتا ہے، اس لئے کہ مادئین دیمقراطیس کی تقلید میں ذرات مادی کو اجزائے لایتجزیٰ یعنی ناقابل انقسام اجزا سمجھتے تھے مگر آج ایٹم (ذرہ مادی) کے تجزیہ سے ثابت ہوگیا کہ مادہ وہاں تک قابل تجزیہ و انقسام ہے جہاں تک اس کا کوئی وجود جسمانی باقی رہے، ٹھوس اجسام کی تحلیل شعاعوں میں ہو جاتی ہے اور شعاعیں انرجی کے انعکاسی مظاہر معلوم ہوتی ہیں۔

نظریۂ اضافیت جدید سے بھی مکان و زماں کا تصور صرف اضافی ہی نہیں بلکہ محض ایک ریاضیاتی تناسب معلوم ہوتا ہے، پھر جہاں، مکان و زماں کی یہ حقیقت تیقن ہو وہاں مادے اور مادئیت کا وجود کہاں، اس لئے کہ مادے کے تصور کے ساتھ تو حیز (جگہ) اور مکان یا محل و حال کے تصورات تو جزو لاینفک[2] کی حیثیت رکھتے ہیں۔

نظریہ تصوریت قدیم و جدید میں بھی مادے اور مادیت کی حیثیت صرف ایک تصور نفسی یعنی داخلی تصور ثابت کی گئی ہے۔ اس تمام تفصیل کا حاصل یہ ہے کہ کائنات محسوسات کی حقیقت وہ نہیں ہے جو مادئین سمجھتے آئے ہیں۔ مادے کے لغوی معنی اصل کے ہیں مگر اصل کائنات کوئی متحز جگہ گھیرنے والی یا کوئی ممتد (ارض و طول و عمق یا جسم و حجم رکھنے والی شے) نہیں ہے، ایک تابناک (نوری) بساطت ہے، اس لئے مادے کے معنی وہ نہیں سمجھے جا سکتے جو مادئین سمجھتے آئے ہیں۔ اس نقطۂ نظر سے بشری خودی اپنے سر چشمہ نوری کی ایک موج ہی سمجھی جا سکتی ہے نہ کہ کوئی کیفیت مادی۔

---

1 ع صورت از بے صورتی آمد پدید
یہ محققین اسلامی کا دیرینہ انکشاف ہے۔

2 جزو لاینفک کسی شے کا ایسا جزو جو اس سے جدا نہ ہوسکے یعنی اسکی ذاتیات میں شامل ہو۔

اب ایک دوسرے رخ سے مادے اور مادیت (جسم و جسمانیت) کی اصل پر نظر ڈالئے : —

جہاں، مشت گل و دل حاصل اوست
ہمیں یک قطرۂ خوں، شکل اوست
نگاہ ما دوبیں افتاد، ورنہ
جہان ہر کسے اندر دل اوست (پیام مشرق)

ہر شخص کا جہان اسکے دل کے اندر ہے، اس خود شعوری کی روشنی میں یہ نظر آتا ہے کہ ہمارے محسوسات کی دنیا میں جسے ہم خارجی شے التباس حواس کی وجہ سے سمجھتے ہیں (حالانکہ وہ محض ایک داخلی تاثر نفس ہے) کائنات میں دو طرح کی چیزاں متصور ہیں۔ ایک تو وہ جنکو مظاہر عارضی و غیر مستقل کہتے ہیں اور ان کی مثال پرچھائیوں کی سی ہے، پرچھائیوں یا سایہ کا کوئی اپنا وجود نہیں ہوتا ہے بلکہ وہ آفتاب کی روشنی اور روشنی کا اپنے اندر سے راہ دینے والی چیزوں کی ایک درمیانی نسبت ہوتا ہے اسی کو دھوپ کے مقابلہ میں سایہ کہتے ہیں ۔ انسانی حواس بھی اس نور وجود کی علمی شعاعوں کو جو محیط موجودات ہے اپنے اندر سے اپنی عدم صلاحیت کی وجہ سے گذرنے نہیں دیتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ہمارا تصور کائنات حجاب حقیقت اور شروع سے ابتک حواس انسانی میں ایک مستقل جسمانی وجود کی حیثیت میں ہے ۔ دوسری قسم میں وہ جوہر مستقل داخل ہے جو حامل جملہ مظاہر و اضافیات ہے ۔ جو ایک حقیقت ہے ۔

مخصوص نظریہ وحدت وجود (فلسفہ ابن عربی رح) اور نظریہ وحدت مشہود (انکشاف حضرت علاء الدولہ سمنانی و مجدد صاحب) میں بھی داخلیت نفس انسانی کا وجود مسلم ہے اور عقیدہ توحید قرآنی میں آیت فی انفسکم کی تفسیر سے تو یہ حقیقت بالکل بے نقاب ہو جاتی ہے کہ احساس و ادراک کائنات و موجودات محض ایک داخلی شے مضمر نفس انسانی ہے ۔ مقصود تخلیق کے ساتھ ہی تمام مظاہر تخلیق میں یا مقصود تخلیق ہی اساس اس کائنات خلقت کی ہے جو تابع مقصود تخلیق ہے ۔ جزوی انائے انسانی کی علمی بحث کا آغاز خصوصیت سے اس سوال سے شروع ہوتا ہے کہ انسان میں غیر اکتسابی طور پر شعور ذات کا وجود ہے کہ نہیں ؟ انکار شعور ذاتی تو کوئی دیوانہ و لاالعقل شخص ہی کر سکتا ہے، کوئی ذی شعور انسان تو کر سکتا نہیں ۔ حد یہ ہے کہ منکرین حقائق، (لا اوری) بھی جو اس مسئلہ پر مفکرانہ غور کرتے ہیں وہ بھی

اپنے شعور ناقص ہی کا ثبوت دیتے ہیں۔ یقیناً ہر ذی ہوش شخص اپنی ہستی کا اجمالی شعور رکھتا ہے، اس امر کے ثبوت کے لئے تو کسی دوسری دلیل کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ اس اعتراف کے بعد کہ انسان کی تعریف عاقل و ذی فہم صحیح تعریف ہے، سوال یہ ہوتا ہے کہ جب اسکے اصل سرچشمۂ ہستی و وجود میں شعور کا وجود نہیں تھا تو اس میں کہاں سے آگیا —

خود تجھ میں شعور اپنا کہاں سے آیا — اندر سے ہے دریا تجھے باہر لایا
ہے پر تو نور خود شعوری تیری — خورشید نہ ہوتا تو کہاں تھا سایا

قرآن حکیم :—

الم ترا الی ربک کیف مد الظل الخ
کیا تو نے اپنے رب کی شان ربوبیت کی طرف نہیں دیکھا کہ اسنے کس طرح سائے کو پھیلایا ہے، اگر وہ چاہتا تھا تو اسے ساکن کردیتا۔ یعنی نہ پھیلاتا، پھر ہم نے آفتاب کو اسکے یعنی سائے کی وجود کی دلیل ٹھہرایا۔

ان آیتوں میں یہ حقیقت اظہر من الشمس ہے کہ انسان کا اجمالی شعور ذاتی اپنے مبدائے آغاز شعور و نور کا ایک ظل ہے مگر غیر منور نہیں۔ آفتاب آمد دلیل آفتاب یعنی اپنے مرکز نور و شعور کی ایک دلیل روشن ہے۔

من از بود و نمودم خود خموشم
اگر گویم کہ ہستم، خود پرستم
و لیکن این نوائے سادۂ کیست
کسے در سینہ می گوید کہ ہستم (پیام مشرق)

نفس جزوی و کلی

شعور ذاتی کا وجود مسلم مگر اس شعور کا حامل نظام حیات انسانی میں کون ہے۔ کیا پوٹاسیم، میگنیسیم، فاسفیٹ، فولاد وغیرہ یعنی عناصر جسمانی ہیں جنکی حقیقت ظاہر ہے کہ وہ اپنی اصل کے بعض غیر شعوری اعراض ہی ہیں ؟ اگر عناصر حامل شعور نہیں تو پھر کون ہے ؟ یقیناً حامل شعور نفس انسانی ہے جو اپنی ذی شعور بساطت کلی یعنی نفس کلی کا ایک جزوی و متعین مظہر ہے۔ ہر جزو اپنے کل ہی کے واسطہ سے متعارف ہوتا ہے۔ موج

کا تعارف دریا ھی اپنے واسطے سے کراتا ہے اگر کل نہو تو کسی جزو کا بھی کوئی وجود قابل تسلیم نہ ہوگا۔ کہنا یہ ہے کہ انسانی نفس جزوی کا وجود بغیر نفس کلی نہیں یعنی ایک ذی شعور بساطت کلی جو محیط ھر جزو کل عالم ہے اسکا ایک جزو ذی شعور نفس انسانی ہے۔ اگر سائنس کے اس جدید تجرباتی انکشاف میں کہ تمام عالم اجسام کی اصل ایک قوت بسیط انرجی ہے اتنا اضافہ اور کر لیا جائے کہ وہ بساطت کلی (انرجی) ذی شعور بھی ہے تو مادئیت اور روحانیت کے درمیان جو عرصہ سے ایک ایسی خلیج حائل ہے جسکو تل اوٹ پہاڑ ھی کہہ سکتے ھیں چشم زدن میں ہمیشہ کے لئے غائب ھوسکتی ہے مگر حواس بشری جو انسان کو قفس کم و کیف کا خوگر بنا کر شروع سے علی الاکثر اس قفس ھی کو آشیانہ بنا رہے ھیں آسانی سے اپنے مغالطوں سے فکر بشری کو بری نہ ھونے دینگے۔

مگر سائنس جدید کا یہ انکشاف کہ اصل جملہ مظاھر کائنات صرف ایک قوت بسیط یا بساطت محض ہے بہت امیدا افزا ہے۔ ممکن ہے کہ مستقبل میں تصور مادئیت کی جگہ وہ تصور روحانیت یا داخلیت لے لے جسکی طرف قرآنی تعلیم ھر انسان کو بلاتی ہے تا کہ اسکے ان مکارم اخلاق کی تکمیل ھوسکے جو لوازم نیابت الہیہ ھیں۔ اھل اسرار دین و قرآن مبین نے ہمیشہ انسانوں کو تنصیلی خودشناسی یا خود شعوری کا پیغام دیکر، مقام لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم کی طرف بلایا ہے اور بڑی حکمت کے ساتھ یہ تعلیم حکمت افراد نوع بشری کو دی ہے۔ ورنہ عطار رح و رومی رح و سعدی رح کا مقصود شعر و شاعری تھا، نہ اس دور میں اقبال رح کا۔

خودی، نفس بشری و انائے انسانی کے علاوہ کوئی دوسری حقیقت نہیں خود کا شعور ھی خودی ہے، خود سے مراد، اصل مرکز شعور ذات ہے (کوئی تکیف مادی نہیں جیسا کہ مادہ پرست گمان کرتے ھیں) جس سے انسان کے تمام احساسات اور ادراکات کا نظام وابستہ ہے اگر اس مرکزیت کو حیات بشر سے حذف کردیا جائے تو انسان اور سنگ و حجر یا انسان اور ارزل ترین حشرات الارض میں کوئی مابہ الامتیاز باقی نہ رہے۔

مگر یہاں اس حقیقت کو واضح کرنا بعض غلط فہمیوں کے ازالہ کے لئے ضروری ہے کہ انا ربکم الاعلی (قول فرعون) اور سبحان ما اعظم شانی

(قول حضرت بایزید بسطامی رح) میں کوئی نسبت نہیں ۔ فرعون کا نقطہ نظر، اس خفاش چشم شخص کی طرح تھا جو اپنی بے بصری کی وجہ سے منکر آفتاب ہو یعنی فرعون کی نظر خدا پر نہ تھی مگر حضرت بایزید بسطامی رح کی پیشانی درگاہ خداوندی میں سجدہ ریز تھی اور بمصداق و سجد وقترب (قرآن) وہ فیضان مقام عبدیت بھی تھا جو کلمہ سبحان ما اعظم شانی سے مترشح ہے ۔

مغرب کے فلسفہ میں جس خودی کی تعلیم ہے وہ محض انانیت و فرعونیت ہے اسلئے کہ علی الاکثر اسکے سامنے خدا نہیں ہے مگر اقبال کے نظریہ خودی کا آغاز ہی عقیدۂ توحید سے ہوتا ہے — حدیث انا من نور اللہ شمع راہ اور اللہ نور السموات والارض کا شہود انفس و آفاق میں منزل مشاہدہ نا محدود ۔ یہی خود شعوری نظریہ اقبال کی اساس خاص ہے ۔

یہاں یہ بتانا بھی بے محل نہ ہوگا کہ بعض صوفیائے کرام کے کلام میں خودی کی مذمت اور اسکے ترک کی تعلیم و ترغیب بھی پائی جاتی ہے کہ اسے حجاب مشاہدۂ حقیقت بتایا گیا ہے مگر اس خودی سے مراد انکی پندار انانیت نمرودی ہے، خودشناسی یا اپنا مقام عبدیت پہچانا یا اسکا عرفان نہیں کہ یہ عرفان ذات تو معرفت باری تعالی کا واسطہ نفسی ہے ۔ وہ قدر ذات جو مرد مومن میں اس مقام کے عرفان سے پیدا ہوتی ہے، اسمیں تو بوریہ فقر عرش اعظم سے بھی بلند محسوس ہوتا ہے ۔ الفقر و فخری (حدیث) اس مقام کی رفعت کی شاہد ہے ۔

لہذا آیات و احادیث اور اہل عرفان کے معارف کے مطالعہ سے آپ اس نتیجہ فکر تک بآسانی پہونچ سکتے ہیں کہ اقبال کا نظریہ عرفان ذات (اسرار خودی) کشافت اسرار حقیقت ہے، موید خود پرستی نہیں ۔ بندگی کی طرف لے جاتا ہے، فرعونی سرکشی کی طرف نہیں ۔ خود شناسی کے بغیر خدا شناسی محال اور خود شناسی کی ابتدائی علامت، اعزا نفس اور مرد مومن کی خود داری ہوتی ہے، جو دل سے قائل لا الہ ہوتا ہے وہ دونوں عالم کی غلامی سے آزاد ہوتا ہے آل و اصحاب رسول اکرم (ص) کی سیرت مبارکہ پر نظر کیجئے ۔ اقبال نے عصر حاضرہ میں جب افراد ملت پر ذہنی و عملی غلامی مسلط تھی ۔ عرفان نفس یا معرفت ذات کا پیغام اس طرح دیا ہے کہ اپنی حقیقی راہ و منزل بھول جانے والے پھر اسوۂ پاک کو شمع راہ و منزل بنا کر گرفتاری اغیار سے آزاد ہوجائیں۔

اقبال عبدیت کامل کے مظہر مکمل کی اتباع کو (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم)

ذریعہ معراج انسانیت بتاتے ہوئے کہتے ہیں —

کیما پیدا کن از مشت گلے　　　بوسہ زن بر آستان کاملے

ظاہر ہے کہ ہمارے لئے رسول اکرم (ص) کی ذات گرامی سے زیادہ کونسی ہستی قابل اتباع ہوسکتی اور کس کے نقش پا پر جبیں سائی کرنے والے کو سر نیاز کو معراج انسانیت بخش سکتے ہیں مگر یہ اتباع بغیر محبت و ربط قلبی ممکن نہیں —

در دل مسلم مقام مصطفیؐ　　　آبروئے ما ز نام مصطفیؐ　　　(اقبال)

مگر ثبوت محبت، پیروی اسوۂ پاک و عمل محکم ہے —

ہست دین مصطفی دین حیات　　　شرح و آئین تفسیر حیات　(اقبال)

پھر فرماتے ہیں —

بہ مصطفی برساں خویش را کہ ایں ہمہ اوست
اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی است

یہ نکتہ بھی انہوں نے اپنے کلام میں واضح کردیا ہے —

عاشقی محکم شو از تقلید یار　　　تا کمند تو شود یزدان شکار

بمصداق اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو، میری پیروی کرو، اللہ کے محبوب ہو جاؤ گے (قرآن پاک) نعت اقدس میں اقبال نے کہا ہے —

یا خدا در پردہ گویم یا تو گویم آشکار
یا رسول اللہ او پنہاں وتو پیدائے من است

ان تاثرات و احساسات کے پیش نظر یہ کسی طرح نہیں کہا جا سکتا کہ اقبال کا نظریہ خودی ایک من مانا یا تعلیم مغربی سے مستعار ایک نظریہ ہے یا ویدانتی ہمہ اوست کا شارح ایک تصور ذہنی ہے۔ اس سے انکار نہیں کہ اقبال مغربی فلسفہ سے پوری طرح واقف تھے مگر مغربی فکر انکا دین و مذہب تو نہیں تھی۔ انکے دل میں تو وہی انوار جھلک رہے تھے جنھوں نے یا جنکی تجلیوں نے شب تاریک عالم میں عرفان و معرفت کے ہزار ہا چراغ روشن کردئیے۔ حضرت رومی سے اقبال کا ربط قلبی اس حقیقت کا شاہد ہے کہ وہ روشنی جو سینہ بسینہ چلی آ رہی تھی اسی کی لو اقبال کے دل میں بھی لگی تھی۔ رحمتہ اللہ علیہ۔